

امریکی جمہوریت کا اصل روپ

”چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر!“

پروفیسر خورشید احمد

جمہوریت اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود دور حاضر کے دوسرے سب سیاسی نظاموں کے مقابلے میں ایک فوقیت رکھتی ہے۔ اس میں دستور اور قانون کی حکمرانی، عوام کی مرضی سے حکومتوں کی تشکیل اور تبدیلی، حکمرانوں کی جواب دہی، انسانی حقوق کی ضمانت، عدلیہ کی آزادی اور معاشرے میں آزادانہ بحث و احتساب بشمول پریس اور میڈیا کی آزادی کو سیاسی نظام کا بنیادی ڈھانچا تصور کیا جاتا ہے اور کسی نہ کسی حد تک اس کا احترام بھی کیا جاتا ہے۔ اگر کہیں اس سے انحراف ہوتا ہے تو بالآخر وہ طشت از بام ہو کر رہتا ہے اور اجتماعی محابے کا نظام حرکت میں آ جاتا ہے۔ یہی وہ عمل ہے جس سے نام نہاد جمہوری قیادتوں کا پول بالآخر کھلتا ہے۔

امریکا کو مغربی دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا دعویٰ ہے اور صدر بش نے دوسری بار صدارت کا انتخاب جیتنے کے بعد تو پوری دنیا میں ’جمہوریت‘ اور آزادی کے فروغ کے لیے ’کروسیڈ‘ کو اپنی خارجہ پالیسی کا مرکزی نکتہ قرار دیا ہے اور خود عراق کے خلاف فوج کشی اور وہاں برپا ہونے والے قتل و غارت گری کے لیے اب اسی دعوے کو بطور ’جواز‘ پیش کر رہے ہیں۔ اب لے دے کے اُن کے اور اُن کے ہم نوا حکمرانوں کے، بالخصوص برطانیہ کے وزیر اعظم ٹونی بلیر کے

پاس کہنے کے لیے بس یہی کچھ رہ گیا ہے کہ ہم نے عراق کو صدام کی آمریت سے نجات دلانی ہے اور 'جمہوری نظام' کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

امریکا کے موجودہ حکمرانوں کی پوری سفارتی اور پروپیگنڈا مہم کے باوجود امریکی سفارت کاری کا یہ سال ان کی تاریخ کا ناکام ترین سال رہا ہے اور 'پبلک ڈپلومیسی' جس پر اربوں ڈالر خرچ کیے جا رہے ہیں، اس کے غبارے سے ہوا نکل گئی ہے۔ دنیا صدر بوش اور امریکی قیادت کے بلند بانگ دعووں کو کوئی وقعت نہیں دے رہی بلکہ وہ ان کی پالیسیوں اور عملی اقدامات کو دیکھ رہی ہے۔ دعوے اور حقیقت میں جو تضاد اور بُعد المشرقین پایا جاتا ہے اس نے امریکا کی ساکھ کو ایسا سخت نقصان پہنچایا ہے کہ اس کی تلافی ممکن نہیں۔ افسوس تو امریکا کے ان حواریوں پر ہے جو مسلم دنیا میں اب بھی امریکا کی کٹھ پتلیاں بنے ہوئے ہیں اور اپنے ہی عوام کے خلاف صف آرا ہیں۔ امریکا کی پالیسی کی ناکامی کا تازہ ترین اعتراف خود بوش صاحب کا وہ ارشاد ہے جو ۶ جنوری ۲۰۰۶ء کو واشنگٹن میں قومی زبانوں کے تحفظ کے ادارے کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا ہے کہ امریکا کے ایجنٹوں کو جس چیز نے بگاڑا ہے، وہ وہ پروپیگنڈا ہے جو دوسرے ممالک کا میڈیا کر رہا ہے۔ خصوصیت سے عرب ممالک کے ریڈیو اور ٹی وی کونشانہ بناتے ہوئے فرماتے ہیں:

جب آپ ان میں سے کچھ ٹی وی انٹینشن دیکھ رہے ہوتے ہیں تو آپ کے سامنے امریکا نہیں آتا۔ عرب ٹی وی ہمارے ملک کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ بعض اوقات وہ ایسا پروپیگنڈا کرتے ہیں جو کسی بھی طرح درست نہیں ہوتا۔ یہ انصاف کی بات نہیں ہے، اور یہ لوگوں کو ہم جو کچھ ہیں، اس کا صحیح تاثر نہیں دیتا۔

اس خطاب میں انگریزی کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں، خصوصیت سے مسلم ممالک کی زبانوں (عربی، فارسی اور اردو) میں بھی امریکی پروپیگنڈے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے اور ان کروڑوں ڈالر پر مستزاد جو اس وقت 'پبلک ڈپلومیسی' کے نام پر خرچ کیے جا رہے ہیں، مزید ۱۴ ملین ڈالر کا ایک نیا منصوبہ بروے کار لانے کا اعلان کیا گیا ہے۔

امریکا کو حق ہے کہ وہ اپنے پروپیگنڈے پر جتنی رقم جب اور جس طرح چاہے خرچ کرے لیکن ایک بنیادی حقیقت نہ صرف امریکا بلکہ سب کے سامنے رہنی چاہیے کہ حقائق پر پروپیگنڈے

کے ذریعے لمبے عرصے تک پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ اب دنیا کے ایک 'گلوبل ویلج' بن جانے کا کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ بہت کم وقت میں ایک مقام کی خبریں دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جاتی ہیں اور اس طرح محض حقائق کو چھپانے یا پروپیگنڈے کے بل بوتے پر اپنے موقف کو پیش (project) کرنے کی گنجائش بہت کم رہ گئی ہے۔ امریکا کی قیادت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اب ہٹلر کے وزیر ابلاغیات جوزف گوبلز کی وہ پالیسی نہیں چل سکتی جس میں جھوٹ کو اتنی بار نشر کیا جاتا تھا کہ لوگ اسے سچ سمجھنے لگتے تھے۔ اب سچ بہت جلد ظاہر ہو کر رہتا ہے۔ اب اصل مسئلہ پروپیگنڈے اور ابلاغ کا نہیں، امریکا کی حکومت اس کی پالیسیوں، افواج اور ذمہ دار حکام کے کارناموں کا ہے۔ جب تک پالیسی اور اس کے اہداف، مقاصد اور اسلوب نہیں بدلتے اور وہ تضادات جو دعوے اور عمل میں موجود ہیں، ان کی اصلاح نہیں ہوتی، محض چرب زبانی، جدید ترین ابلاغی وسائل اور سیاسی ملیح سازی سے استعماری پالیسیوں اور دوسروں کو غلام اور محکوم بنانے والے اقدامات پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا۔ ایک امریکی کالم نگار ولیم فشر (William Fisher) نے اس دو عملی اور تضاد کو بڑے نرم اور ہمدردانہ انداز میں لیکن برملا طور پر یوں ادا کر دیا ہے:

عراق اور شرق اوسط میں رائے عامہ کے مختلف جائزوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ امریکی محرکات اور حکمت عملی کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا ہیں کیونکہ امریکا جو کچھ کہتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے اس میں تضادات پاتے ہیں۔ (US State Department's Mixed Messages، دی نیوز، ۸ جنوری ۲۰۰۶ء، بحوالہ

دی عرب نیوز)

امریکا جس طرح اپنا ایک خاص امیج بنانے کے لیے پانی کی طرح ڈالر بہا رہا ہے صحافیوں کو خرید رہا ہے، تعلقات عامہ کی فرموں کو استعمال کر رہا ہے اور سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ بنانے کی کوشش کر رہا ہے، اس کا پردہ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا ایٹ چیکو (University of California et Chico) کے پروفیسر بین گروس کپ (Bean Grosscup) نے اس طرح چاک کیا ہے:

وہی لوگ جو آزادی صحافت کو فروغ دینے کے لیے پروگرام ترتیب دیتے ہیں، وہی

تعلقات عامہ کی فرموں، شور مچانے والے لوگوں اور خریدے ہوئے صحافیوں سے وابستہ تھنک ٹینکوں کو آزاد میڈیا کے طور پر قوم فراہم کرنے کا دفاع کرتے ہیں۔ ساری بات تعلقات عامہ اور میڈیا کو کنٹرول کرنے کی ہے۔ اس پر جوزف گوبلز بھی فخر کرے گا۔ (دی نیوز، ۳ جنوری ۲۰۰۶ء)

امریکا کے موجودہ حکمران، خصوصیت سے صدر جارج بش، نائب صدر ڈک چینی، وزیر دفاع رمزیلڈ اور ان کے تمام خفیہ اداروں کے کارپرداز جس دیدہ دلیری اور سینہ زوری کے ساتھ امریکی دستور، قانون، کانگریس کے طے شدہ ضابطوں اور بین الاقوامی قانون اور جنیوا کنونشن کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، اس نے مشرق سے مغرب تک ہر طرف ایک تہملکہ سا مچا دیا ہے۔ مسلم ممالک کے عوام تو ایک مدت سے چیخ ہی رہے تھے اب یورپی اقوام بھی پکار اٹھی ہیں اور خود امریکا میں بھی صدر بش اور ان کی پالیسیوں سے عمومی بے زاری کے اظہار کے لیے بغاوت کی ایک لہر اٹھ رہی ہے جس کا سب سے نمایاں مظہر امریکی کانگریس کا یہ اہم اقدام ہے کہ حب الوطنی کے قانون (Patriot Act) کی غیر معینہ عرصے کے لیے صدر بش کی درخواست رد کرتے ہوئے صرف پانچ ہفتوں کے لیے اس کی منظوری دی ہے۔

یاد رہے کہ متذکرہ قانون کو صدر بش نے نائن لیون کے بعد کانگریس سے منظور کرایا تھا اور جسے پہلے سال مکمل اتفاق رائے سے منظور کیا گیا تھا۔ اس کے تحت صدر کو اور نیشنل سیکورٹی اتھارٹی کو ایسے غیر معمولی اختیارات دے دیے گئے تھے جن کو استعمال کر کے وہ دہشت گردی کے شبھے پر لوگوں کو گرفتار کر سکتے ہیں، لمبی مدت تک مقدمہ چلائے بغیر زیر حراست رکھ سکتے ہیں، اور اگر مقدمہ چلانے کی نوبت آئے تو ناگزیر قانونی تقاضے (due process of law) کے بہت سے معروف ضابطوں کو نظر انداز بلکہ پامال بھی کر سکتے ہیں۔ مشہور امریکی رسالے Nation کے مضمون نگار جو ناٹھن شیل (Jonathan Schell) کے بقول اس قانون نے امریکی صدر کو آج کا ایسا ایڈمنسٹریٹر بنا دیا ہے کہ اگر وہ آمریت کی مکمل تصویر نہ بھی ہو تو بھی اس میں وہ ساری خصوصیات پیدا ہو گئی ہیں جن سے آمریت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ حکومت بظاہر آمریت نہیں ہے مگر اس میں آمریت کی سب ابتدائی خصوصیات صاف نظر آتی ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ جو ناٹھن شیل یہ کہنے پر مجبور ہے کہ:

امریکی تاریخ میں صدارتی اختیارات کو سب سے زیادہ وسیع پیمانے پر غلط استعمال

کرنے والا شخص صدر بوش ہے۔ (دی اکا نومسٹ 'لندن' ۷ جنوری ۲۰۰۶ء، ص ۴۰)

امریکی جریدے نائٹ (۹ جنوری ۲۰۰۶ء) میں کیرن ٹولٹی (Karen Tumulty) اور

مائیک ایلو (Mike Allew) اپنے مضمون میں سینیٹ کی جوڈیشری کمیٹی کے رکن سینیٹر پیٹرک لی ہی

(Patrick Leahy) کا یہ جملہ نقل کرتے ہیں کہ:

صدر نکسن کے بعد جس حکومت نے عدالتوں اور قانونی ضابطوں کو نظر انداز کرنے کی

سب سے زیادہ کوشش کی ہے وہ یہی حکومت ہے۔

یہ ہے وہ پس منظر جس میں صدر بوش کے لیے کانگریس کی اس سرزنش (rebuke) کی

اہمیت کو سمجھا جاسکتا ہے کہ جب الوطنی کے جس قانون کی سال بہ سال تجدید (renewal) سے

بچنے کے لیے صدر بوش نے کانگریس سے اس کی غیر معین مدت کے لیے تجدید کی قانونی تجویز پیش

کی تھی بلکہ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ we cannot afford to be without this law

for a single moment (ہم اس قانون کے بغیر ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چل سکتے)؛

اسے عظیم اکثریت نے رد کر دیا اور صرف ۵ ہفتے کے لیے اس کی تجدید کی — یعنی ۵ فروری ۲۰۰۶ء

تک۔ ساتھ ہی تفتیش کے دوران تعذیب یعنی ٹارچر (torture) کا دروازہ بند کرنے کے لیے جو

ٹرمین سینیٹر میک کین (Mc Cain) نے پیش کی تھی اور جسے بوش نے ویٹو کرنے کی دھمکی دی تھی؛

اسے بھی سینیٹ نے ۹ کے مقابلے میں ۹۰ ووٹ سے منظور کر کے یہ پابندی لگا دی کہ تمام امریکی

ایجنسیوں کے لیے نہ صرف امریکا کی سرزمین پر بلکہ دنیا میں کہیں بھی زیر حراست دشمنوں کو ایسے

تمام ہتکنڈوں کا نشانہ بنانا خلاف قانون ہوگا جو ظالمانہ غیر انسانی اور ذلت آمیز ہوں۔ واضح رہے

کہ آخری وقت میں ڈک چینی نے پوری کوشش کی کہ کم از کم سی آئی اے کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا

جائے مگر سینیٹ نے یہ ماننے سے انکار کر دیا اور امریکا کی موجودہ حکمران ٹیم جو کھیل کم از کم چار سال

سے کھیل رہی ہے عالمی احتجاج کے تحت اسے اس سے روکنے کا عندیہ دیا۔ آئندہ امریکی انتظامیہ

اس کا کتنا احترام کرتی ہے یہ تو مستقبل ہی بتائے گا لیکن کانگریس کے یہ دونوں اقدام بوش انتظامیہ

پراس چارج شیٹ کی تصدیق کرتے ہیں جو حقوق انسانی کی تنظیمیں اور عالم اسلام اور تیسری دنیا کے دانش ور لگا رہے تھے۔

اس سلسلے میں ہم صرف چند اہم اور نمایاں حقائق ریکارڈ پر لانا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ صدر بش کے تحت امریکی جمہوریت کا اصل چہرہ سب کے سامنے آجائے اور اس آئینے میں خود ان مسلمان ممالک کی قیادتوں کی شکل بھی دیکھی جاسکے جو صرف امریکا کی خوش نودی کے لیے اپنے اپنے ملکوں میں نام نہاد دہشت گردی کی جنگ میں شرکت کے نام پر انسانی حقوق اور آزادیوں کا خون کر رہے ہیں۔

جمہوریت کا ایک بنیادی اصول دستور اور قانون کی پاسداری ہے۔ مطلق العنان بادشاہت اور آمریت میں حکمران دستور اور قانون سے بالا رہتے ہیں اور اپنی من مانی کرتے ہیں جب کہ جمہوریت میں ہر صاحب اقتدار اپنے لیے جواز حکمرانی دستور اور قانون سے پاتا ہے اور اس کا پابند ہوتا ہے۔ صدر بش اور ان کی انتظامیہ نے خود کو دستور سے بالاتر کر لیا ہے اور وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر دستور کی ان تمام ضمانتوں کو پامال کر رہے ہیں جو قانون کی حکمرانی، نجی زندگی (privacy) کی حفاظت، عدالت کی اجازت کے بغیر کسی شہری کی ڈاک، ٹیلی فون، انٹرنیٹ وغیرہ کی جاسوسی کی مکمل ممانعت کے بارے میں تھیں۔

یہ انتظامیہ اس سلسلے میں ایک عظیم جرم کی مرتکب ہوئی ہے۔ اس نے ہزاروں انسانوں کی نجی زندگی کو پوری بے دردی سے مجروح کیا ہے اور چار سال سے کروڑوں کی تعداد میں ان کے پیغامات کو درمیان میں روکا (intercept کیا) ہے۔ اور اس سلسلے میں غیر معمولی حالات کے لیے جو گنجائش پیدا کی گئی تھی کہ ایسے معاملات میں خود نیشنل سیکورٹی اتھارٹی اپنی ۱۲ کئی سرکاری جوڈیشل کمیٹی سے رجوع کرنے اس کی پابندی نہیں کی گئی، محض القاعدہ کی بوسونگھنے کے لیے بے دریغ لاکھوں ٹیلی فون کالوں اور ای میل کو سی آئی اے اور دوسری ایجنسیاں درمیان میں روکتی رہیں۔ یہ اقدام دستور، قانون، بنیادی حقوق اور شائستگی ہر چیز کی کھلی خلاف ورزی تھی جس کا پوری بے باکی

سے ارتکاب کیا گیا۔ اس پر متزاد یہ کہ جب اس کی سگن لوگوں کو ملنا شروع ہوئی اور کچھ اخبارات نے اس راز کو فاش کرنے کی کوشش کی تو ان کو روکا گیا حتیٰ کہ نیویارک ٹائمز کو خود صدر بش نے ذاتی طور پر اس رپورٹ کے انکشاف سے روکا اور اس سرکاری مداخلت کے نتیجے میں جمہوری امریکا کے جمہوری پریس نے اس خبر کو ایک سال تک دبائے رکھا مگر بالآخر دسمبر ۲۰۰۵ء کے وسط میں یہ خبر اخبارات میں شائع ہوگئی۔ نیویارک ٹائمز نے اپنی ۱۵ دسمبر ۲۰۰۵ء کی اشاعت میں جیمز رائزر (James Riser) اور لچ بلان (Lichtblan) کی تہلکہ مچا دینے والی رپورٹ شائع کی۔ جیمز رائزر کی کتاب *State of War: The Secret History of the CIA and Bush Administration* کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد اب یہ تفتیش ہو رہی ہے کہ یہ راز فاش کیسے ہو گیا؟ حالانکہ بش انتظامیہ کا یہ جرم تو ایسی سنگین نوعیت کا ہے کہ وہ امریکی صدر کو مواخذے (impeachment) کا سزاوار بناتا ہے۔ اب دبے الفاظ میں یہ بات کہی جانے لگی ہے اور یہ امریکی جمہوریت کا امتحان ہے کہ کیا بش یہ سب کچھ کرنے کے بعد بچ نکلتا ہے یا کیفر کردار کو پہنچتا ہے؟ سینیٹر رابرٹ ہارڈ (Robert Byrd) کہتے ہیں کہ بش نے وہ لامحدود اختیارات ہتھیالیے ہیں جو بادشاہوں اور مہاراجوں کے لیے مخصوص ہوا کرتے تھے۔ اور امریکی کانگریس کے دو ارکان جان لیوس (John Lewis) اور جان ڈین (John Deen) نے کہا ہے کہ بش نے جس طرح دستور، قانون، عدالتی نظام کو پامال کیا ہے، اس کی پاداش میں اس کا مواخذہ ہونا چاہیے۔

بات صرف امریکی شہریوں کی آزادیوں کی پامالی کی نہیں، دسمبر ہی کے مہینے میں ایک دوسرا بڑا ایکنڈل وہ اطلاعات ہیں جن کا ماخذ ایک اطالوی دستاویزی فلم ہے جس سے یہ ہوش ربا انکشاف ہوا کہ امریکا دہشت گردی کے شہجے میں پکڑے جانے والے قیدیوں کو تعذیب کا نشانہ بنانے کے لیے یورپ میں کم از کم آٹھ خفیہ تعذیب خانے چلا رہا ہے۔ علاوہ ازیں یورپ کے دسیوں ممالک کے ہوائی اڈوں اور فضائی حدود کو ان قیدیوں کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اور گذشتہ دو سال میں ایک ایک ملک میں ایسی دو دو سو پروازیں کی گئی ہیں۔ جرمنی، آئرلینڈ، پولینڈ، رومانیہ، اسپین وغیرہ اس راز کے فاش ہونے پر سخت

آتش زیر پا ہوئے اور امریکا کی طرف سے ان کی اجازت کے بغیر ان کی فضائی حدود اور ہوائی اڈوں کے استعمال اور تعذیب کے لیے قیدیوں کی کھلی منتقلی پر سخت احتجاج ہوا۔ برطانیہ میں بھی ایسی ۲۰۰ پروازوں کا ریکارڈ گارڈین اخبار نے فاش کیا لیکن حکومت نہ تصدیق کرتی ہے اور نہ تردید۔ سب سے شرمناک پہلو یہ ہے کہ بہت سے عرب اور مسلمان ممالک کو اس تعذیب کے لیے استعمال کیا گیا اور خصوصیت سے مصر، افغانستان، الجزائر اور مراکش کا کردار بڑا گھناؤنا اور شرمناک ہے۔ اس ایکنڈل کے اثرات امریکا اور یورپ کے تعلقات پر بھی بڑے دور رس ہو سکتے ہیں۔ انھیں ٹھنڈا کرنے کے لیے امریکی وزیر خارجہ کوئٹہ ویزا راس نے فوری طور پر یورپی ممالک کا دورہ کیا مگر آگ بظاہر سرد ہوتی نظر نہیں آتی۔

امریکا جمہوریت اور انسانی حقوق کا علم بردار بنتا ہے مگر اس کا جو کردار سامنے آیا، وہ یہ ہے کہ اس نے اپنے دستور کی کھلی کھلی خلاف ورزی کی، اپنی عدالتوں سے رجوع کرنے سے گریز کیا، اپنے زیر انتظام دنیا کے مختلف ممالک میں قید خانے اور محبوت خانے قائم کیے اور خود اپنے دوست ممالک کے قانون اور حاکمیت (sovereignty) کی کھلی کھلی خلاف ورزی کی۔ نیز ٹارچر سے احتراز کے اپنے تمام دعووں کے باوجود بلا واسطہ اور بالواسطہ معصوم انسانوں کو جو سب ہی مسلمان تھے، مسلسل چار سال تک غیر قانونی اور غیر انسانی تعذیب (torture) کا نشانہ بنایا۔ اس کی کہیں کوئی دادرسی نہ ہوئی بلکہ کچھ مسلمان حکمران ظلم کے اس کھیل میں امریکا کے آلہ کار بنے اور ابھی تک وہ ہر احتساب سے بالاتر ہیں۔

ابوغریب کی جیلوں میں جو کچھ امریکا نے کیا تھا اور جس کے ۶۰۰ واقعات اتنے ہولناک تھے کہ عالمی دباؤ میں امریکا کو بظاہر ان کا نوٹس لینا پڑا، جب کہ ہزاروں واقعات پر پردہ پڑا رہا۔ اس نے ساری دنیا میں امریکا کے دہرے معیار کا بھانڈا پھوڑ دیا اور وہ استبدادی جھٹکنڈے سب کے سامنے آگئے جو جمہوریت کے یہ علم بردار بے دریغ استعمال کر رہے تھے اور دنیا کو تہذیب کا درس دے رہے تھے، بلکہ کہہ رہے تھے کہ دہشت گردی اس لیے فروغ پاری ہے کہ ان لوگوں کو ہماری آزادی اور جمہوریت بری لگتی ہے۔

پھر اسی زمانے میں اس خبر نے امریکا کے امیج کو بڑی طرح مجروح کیا کہ امریکی افواج

نے فلوجہ کے محاذ پر ۲۰۰۴ء میں سفید فاسفورس کا بے دریغ استعمال کیا ہے جو ایک کیمیائی ہتھیار ہے اور بین الاقوامی قانون کے مطابق اس کا استعمال انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے۔

لاس اینجلس ٹائمز کا مضمون نگار جو ناٹھن بی ٹکر (Jonathan B. Tucker) کیمیادی ہتھیاروں پر سنڈ کا درجہ رکھتا ہے، اور کئی کتب کا مصنف اور Monterey Institute's اور Center for Non-Proliferation کا سینئر فیلو ہے۔ وہ ان نام وراہل قلم میں سے ہے جو اس کا کھلا اعتراف کر رہے ہیں کہ عراق میں امریکا نے کیمیادی بم استعمال کر کے اپنا منہ کالا کیا ہے اور اس پر جو عالمی ردعمل رونما ہوا ہے وہ بالکل جائز اور امریکا کے لیے باعث شرم ہے:

ویت نام کی جنگ کا ایک اُن مٹ نقش بری طرح جلی ہوئی اس بے لباس ویت نامی لڑکی، کم فک کا تھا جو سڑک پر دوڑتی ہوئی درد اور وحشت سے چیخ رہی تھی۔ یہ ۱۹۷۲ء کا واقعہ ہے۔ کم فک کے گھر پر ویت نام کے ہوائی جہاز نے غلطی سے نیپام بم گرا دیا تھا۔ وہ اور تو کچھ نہ کر سکی، اس نے بے بسی کے عالم میں اپنے کپڑے پھاڑ لیے۔ معصوم شہریوں کے خلاف اس ہولناک ہتھیار کے حادثاتی استعمال نے، جسے اس تصویر نے لافانی بنا دیا تھا، عالمی راہے عامہ کو جنگ کے خلاف منظم کرنے میں مدد دی۔

اب تین عشروں کے بعد نومبر ۲۰۰۴ء میں عراقی مزاحمت کاروں کے خلاف فلوجہ کی جنگ میں امریکا نے ایک دوسرا آتشیں ہتھیار سفید فاسفورس استعمال کیا ہے۔ اس پر امریکا کو خصوصاً باہر کی دنیا میں تنقید کے طوفان کا سامنا ہے۔ سفید فاسفورس جسے عرف عام میں ڈبلیو پی (wp) کہا جاتا ہے، ہوا میں تحلیل ہونے پر اپنے آپ بھڑک اُٹھتا ہے اور اس وقت تک خوفناک طریقے سے جلتا رہتا ہے جب تک کہ آکسیجن ختم نہ ہو جائے۔ اس کے آتشیں ذرات بیرونی کھال پر؟ جاتے ہیں، گوشت کو ہڈیوں تک گلا دیتے ہیں اور انتہائی گہرے کیمیائی زخم پیدا کرتے ہیں جو ہلاکت خیز نہ بھی ہوں مگر شدید تکلیف دہ ہوتے ہیں اور مندمل ہونے میں بڑا وقت لیتے ہیں۔

فلوجہ میں جہاں صرف جنگجوی نہیں تھے، عام شہری بھی موجود تھے، آتشیں اسلحے کا استعمال تین وجوہات سے شدید غلطی تھا۔ اول یہ اخلاقی طور پر غلط تھا، دوسرے یہ عراق میں

امریکی پالیسی کے مقاصد کے خلاف تھا، اور تیسرے یہ ایک منافقانہ طرز عمل تھا جو امریکا کے خلاف عالمی غم و غصے کو ایندھن فراہم کرتا تھا جس سے جہادی دہشت گردوں کی بھرتی کے لیے واضح جواز فراہم ہوتا تھا۔

جو ناگھن نگر جس نتیجے پر پہنچا ہے وہ پوری دنیا کے عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس نے امریکا کے خلاف دنیا بھر میں نفرت کی آگ کو بھڑکایا ہے:

ابوغریب میں قیدیوں سے شرمناک سلوک، سمندر پار ممالک میں سی آئی اے کے قید خانوں کا اسکیٹل اور فلیوجہ میں سفید فاسفورس کا استعمال درحقیقت ایک ہی تصویر کے مختلف رخ ہیں۔ یہ اس حکومت کی اخلاقی جس کے فقدان کی عکاسی کرتے ہیں جس نے امریکا کو دنیا کی نظروں میں ایک بدمعاش ریاست بنا دیا ہے۔

اسی بات کو نوم چوسکی نے نیوزویک کے مائیکل ہسٹنگ (Michael Hasting) کو

دیے گئے انٹرویو میں اس طرح بیان کیا ہے:

بش انتظامیہ امریکا کو دنیا میں سب سے زیادہ خونخاک اور قابل نفرت ملک بنانے

میں کامیاب ہوئی ہے۔ اس باب میں ان لوگوں کی صلاحیت ناقابل یقین ہے۔

(نیوزویک، ۹ جنوری ۲۰۰۶ء، ص ۵۲)

ہم یہاں اتنا اضافہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ٹارچر کے استعمال کے علاوہ ظالم اور مطلق العنان حکمرانوں اور خصوصیت سے فوجی آمروں کی پشت پناہی کے سلسلے میں امریکا کی پالیسی نئی نہیں ہے۔ بلاشبہ بش انتظامیہ نے اسے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا ہے لیکن بد قسمتی سے یہ امریکا کی تاریخی پالیسی کا شرمناک حصہ رہی ہے اور اندرون ملک جمہوریت اور آزادی کا اگر کچھ نہ کچھ پاس کیا گیا ہے، تب بھی اس سے انکار مشکل ہے کہ بین الاقوامی سطح پر جنوبی امریکا سے لے کر ایشیا اور افریقہ کے تمام ہی علاقوں تک ٹارچر اور آمریت دونوں کے فروغ میں امریکا کا بڑا اہم کردار ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۹۴۶ء سے ۱۹۸۳ء تک پانامہ اور بعد میں Fort Benning, Georgia کے مقام پر امریکی فوج کے زیر اہتمام School of the Americas کے نام سے ایک ادارہ قائم تھا جس میں امریکا اور دوسرے ممالک کے فوجیوں اور

ایجنسیوں کے لوگوں کو ٹارچر اور ظالمانہ تفتیش کے طور طریقوں اور اس سلسلے میں جدید ترین آلات تعذیب کے استعمال کی باقاعدہ تربیت دی جاتی تھی۔ اسی اسکول کے تربیت یافتہ عملے نے جنوبی امریکا اور دنیا کے دوسرے ممالک بشمول عرب ممالک میں ٹارچر کے ایک سیاسی آلے کے طور پر استعمال کو رواج دیا۔ اس سلسلے کے سارے حقائق، اخبارات اور رسائل میں تو آتے رہے لیکن پورے دستاویزی ثبوت کے ساتھ یہ ایک تازہ ترین کتاب کی شکل میں بھی شائع ہو گئے ہیں جسے الفرڈ میکائے (Alfred McCoy) نے مرتب کیا ہے اور جو *A Question of Torture* کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ (ملاحظہ ہو گارڈین، لندن میں نوم کلین (Noam Klein) کا مقالہ 'US has been using Torture for Decades' ڈان/گارڈین سروس' ۱۱ دسمبر ۲۰۰۵ء)

آج گوانتانامو بے کے سیکڑوں قیدیوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا جا رہا ہے، اور اب تک یورپ اور عرب ممالک کے تعذیب خانوں میں امریکا کے ایما پر جو کچھ کیا جاتا رہا، جس طرح قیدیوں کو ملک ملک بھیج کر ٹارچر کا نشانہ بنوایا گیا اور ابوغریب عراق کے دیگر قید خانوں اور افغانستان کے متعدد قید خانوں میں جو کچھ کیا جاتا رہا ہے وہ کوئی نئی چیز نہیں۔ امریکی وزیر دفاع رمزفیلڈ نے تو صاف کہا ہے کہ تفتیش کے لیے غیر معمولی ذرائع کا استعمال ضروری ہے۔ بات صرف رمزفیلڈ کی نہیں، سارے قرآن ظاہر کرتے ہیں کہ ٹارچر کی نہ صرف اجازت بلکہ اس کے کھلے استعمال کی ہدایت یا حکم کا رشتہ صدر بش تک پہنچتا ہے۔ نوم کلین لکھتا ہے:

ہمیں اس بارے میں واضح ہونا چاہیے کہ کیا چیز ہے جس کی پہلے مثال نہیں ملتی: ٹارچر نہیں، بلکہ اس کا کھلا کھلا ذکر۔ ماضی کی حکومتیں اپنے ان سیاہ کرتوتوں کو خفیہ رکھتی تھیں، جرائم کی اجازت ہوتی تھی لیکن ان کا ارتکاب چھپ چھپا کر کیا جاتا تھا، سرکاری سطح پر اس کی تردید اور مذمت ہی کی جاتی تھی۔ بش انتظامیہ نے یہ تکلف ختم کر دیا ہے۔ نائن الیون کے بعد اس نے بلاکسی جھگ اور شرم و حجاب کے ٹارچر کرنے کے حق کا مطالبہ کیا، جس کو نئی تعریفوں اور نئے قوانین سے جواز فراہم کیا۔

ٹارچر، امریکا اگر اپنے ملک کی حدود سے باہر کر رہا ہے، تب بھی اس کا جواز کسی صورت

فراہم نہیں ہوتا لیکن اصل اعتراض تو نارچر کے ارتکاب پر ہے، خواہ کہیں ہو۔ امریکی انتظام میں چلنے والے قید خانوں میں، امریکی شہری قیدیوں کو نارچر کرتے ہیں اور انھیں امریکی جہازوں میں ہی دوسرے ممالک میں منتقل کیا جاتا ہے۔ خفیہ کاموں کے لیے ضروری طور طریقوں کو بالائے طاق رکھنے کے عمل نے فوجی اور خفیہ سروس کی برادری کو مخالفت میں کھڑا کر دیا ہے۔ بش نے یہ صورت پیدا کر دی ہے کہ کوئی بھی ایسی تردید نہیں کر سکتا جس پر یقین کیا جاسکے۔ یہ تبدیلی بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ جب نارچر خفیہ طور پر کیا جائے لیکن سرکاری اور قانونی طور پر انکار کیا جائے تو امید ہوتی ہے کہ جب ظلم بے نقاب ہوگا تو انصاف میسر آئے گا۔ لیکن جب یہ قانون کے پردے میں ہو اور جو ذمہ دار ہوں وہ انکار کریں کہ یہ نارچر ہے تو انسان کے اندر وہ مر جاتا ہے جسے ہنر آرنڈٹ (Hannah Arendt) نے انسان کے اندر کا منصف قرار دیا ہے۔ جلد ہی متاثرہ لوگ انصاف کے حصول سے مایوس ہو کر اور اس کی کوشش میں خطرات کا یقین ہونے کی بنا پر اس کی کوشش ہی ترک کر دیتے ہیں۔ یہ بڑے پیمانے پر وہی کچھ ہے جو کسی عقوبت خانے میں ہوتا ہے جہاں قیدیوں کو بتایا جاتا ہے کہ وہ جتنا چاہیں جین لیں، کوئی ان کے چیخنے چلانے کو نہیں سن سکتا اور نہ کوئی انھیں بچانے کے لیے آئے گا۔

(ذات بحوالہ دی گارڈین نیوز سروس، ۱۱ دسمبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۲)

الفریڈ میک کوائے نے نارچر کے سلسلے میں امریکا کے تاریخی جرائم کے دستاویزی ریکارڈ کو پیش کر کے دنیا کے اور خود امریکا کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے: بات اِکا دکا واقعات یا چند قانونی ترامیم کی نہیں، اگر حالات کو بدلنا ہے تو ظلم کے اس پورے نظام کو بدلنا ہوگا۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ اداروں اور حکومت کی شرکت کی تاریخ اور گہرائی کو نہیں سمجھیں گے تو آپ بامعنی اصلاحات کا آغاز نہیں کر سکتے۔ (ایضاً)

ان سنگین الزامات کے ساتھ امریکی جمہوریت پر ایک اور بدنما داغ بلکہ اس کے ایک مہلک ناسور کے بارے میں بھی انکشاف ہوا ہے جس کا تعلق صحافت کی آزادی سے ہے۔ بلاشبہ

امریکا میں صحافت اور میڈیا کو بڑی آزادی میسر ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ امریکا کے میڈیا پر چند گروہوں کا قبضہ ہے جو اسے اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اس سلسلے میں سرفہرست صہیونی لابی ہے جس کے اثرات پر ایک نہیں دسیوں کتب شائع ہو چکی ہیں۔ ایڈورڈ سعید اور نوم چومسکی نے اس موضوع پر خاصا تحقیقی کام کیا ہے۔ دوسری بڑی لابی اب نیوکونز (Neo-Cons) کی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ چشم کشا انکشافات وہ ہیں جو خود امریکی حکومت کے کردار کے بارے میں سامنے آرہے ہیں۔

صدر بش ڈک چینی اور حکومت کے اہم کارپرداز بلا واسطہ پریس کو مشورے (advice) دیتے رہے ہیں۔ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ صحافت اور میڈیا میں سرکاری ایجنسیوں کے تنخواہ دار بڑی تعداد میں کام کرتے ہیں۔ حکومت کی ہدایات پر بڑے بڑے اخبارات نے نہایت اہم خبریں دبا (kill کر) دی ہیں یا ان کی اشاعت کو مہینوں موخر کیا، اور پھر اسی وقت شائع کیا جب ان کے کسی نہ کسی صورت باہر آنے کا امکان صاف نظر آنے لگا۔ یہ بھی اب دستاویزی شہادتوں کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے کہ امریکی فوج کے ساتھ جو صحافی ہوتے ہیں اور جن کو embedded journalists کہا جاتا ہے، وہ اپنے چشم دید حقائق کو بیان نہیں کرتے بلکہ دراصل فوج کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس طرح صحافت کو بھی فوج کی مہم کا ایک حصہ بنا دیا گیا ہے۔ پھر اس کی شہادتیں بھی سامنے آگئی ہیں کہ فوج نے خطیر رقم دے کر عراق ہی میں نہیں، ہر جگہ اپنے مفید مطلب مضامین لکھوائے ہیں اور خبروں کو خاص رنگ دلویا ہے۔ امریکا اور برطانیہ دونوں جگہ صحافیوں کو ایک خاص انداز میں واقعات کے بیان پر آمادہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں رابرٹ فسک (Robert Fisk) نے لندن کے اخبار انڈی پنڈنٹ میں بڑا تفصیلی اور حقائق سے بھرپور مواد شائع کیا ہے۔ اب تو یہ واقعہ بھی طشت از بام ہو چکا ہے کہ خود بش نے الجزیرہ ٹی وی پر بم باری کرنے کی بات کی تھی مگر ٹونی بلیر نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ جب یہ خبر شائع ہوئی تو ٹونی بلیر اور برطانیہ اور امریکا کی ایجنسیوں کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ یہ بات باہر کیسے نکل گئی۔ آزادی صحافت کے دعوے داروں کے ان کرتوتوں نے دنیا کی نگاہوں میں ان کی ہی نہیں، بڑے بڑے اخبارات کی ساکھ (credibility) کو بھی مجروح کیا ہے۔

امریکا کا یہی وہ دوغلا رویہ ہے جس نے دنیا کے عوام کو مایوس کیا ہے اور جمہوریت، آزادی اور حقوق انسانی کے امریکی دعووں کی کوئی وقعت باقی نہیں رہی ہے۔ امریکا کے مجرم ضمیر کی بہترین ترجمانی خود اس کے سابق صدر جمی کارٹر نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں کی ہے جس کا حسب ذیل اقتباس سنجیدہ غور و فکر کا متقاضی ہے اور خود امریکا کی موجودہ قیادت کے لیے لمحہ فکریہ ہے:

حالیہ برسوں میں میری اس تشویش میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے کہ حکومت کی انتہا پسندانہ پالیسیوں نے ہمارے ان بنیادی اصولوں کو زبردست نقصان پہنچایا ہے جن کا ماضی کی ساری ڈیموکریٹ اور ری پبلکن حکومتوں نے سختی سے تحفظ کیا تھا۔ ان میں امن، معاشی و سماجی انصاف، شہری آزادیوں اور بنیادی انسانی حقوق جیسے اصول شامل ہیں۔ موجودہ حکومتی طرز عمل نے شہریوں کو مہنی برصداقت اطلاعات فراہم کرنے، اختلافی آوازوں اور دوسروں کے نظریات کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آنے جیسے پختہ امریکی تصورات کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔ امریکی قیادت، یہ اندازہ کیے بغیر ساری دنیا پر سامراجی بالادستی قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے کہ ہمیں اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی ہے یا آئندہ ادا کرنی ہوگی۔ دہشت گردی کے خطرے سمیت باہمی مفادات کے مختلف امور پر دوسرے ممالک سے خوش دلانہ اتفاق رائے اور اتحاد قائم کرنے کے بجائے ہم نے اس شاہی فرمان کا سہارا لیا کہ ”تم ہمارے ساتھ ہو یا ہمارے خلاف؟“ انسانی حقوق کے عظیم چیمپین کے طور پر اپنے تصورات کی سر بلندی کے لیے کوشش کرنے کے بجائے ہم شخصی اور شہری آزادیوں کی کھلی خلاف ورزیاں کر رہے ہیں۔ کس قدر شرم کی بات ہے کہ صدر اور نائب صدر اس بات پر اصرار کر رہے ہیں کہ کسی آئی اے کو زیر حراست افراد سے ظالمانہ، غیر انسانی اور توہین آمیز برتاؤ کی اجازت ہونی چاہیے۔ دنیا کی واحد سو پر پاور کی حیثیت سے امریکا کو امن، آزادی اور انسانی حقوق کا پر عزم چیمپین اور انسانی ہمدردی کے کاموں کا ہر اول دستہ ہونا چاہیے۔ وقت آ گیا ہے کہ سیاسی تقسیم سے قطع نظر، سارے امریکی اپنے اس مشترکہ عہد کو تازہ کریں کہ ہم پھر سے ان سیاسی و اخلاقی اقدار کا احیا کریں گے جنہیں ہم نے ۲۳۰ سالوں سے سینے سے

لگا رکھا تھا۔ (نوائے وقت، ۱۸ نومبر ۲۰۰۵ء)

آخر میں ہم ہرالد پینٹر (Harold Pinter) کی اس ویڈیو تقریر کے چند اقتباس دینا چاہتے ہیں جو اس نے اس سال کا نوبل پرائز وصول کرتے وقت کی اور اس نے امریکا کے حقیقی کردار کو اس عالمی فورم پر بڑے دو ٹوک انداز میں پیش کر کے پوری دنیا کے انسانوں کے جذبات کی ترجمانی کی۔ اس نے کہا:

کسی خود مختار ریاست پر براہ راست حملہ کبھی بھی امریکا کا پسندیدہ طریقہ نہیں رہا۔ اس نے ہمیشہ عام طور پر اس طریقے کو ترجیح دی ہے جسے کم شدت کا (low intensity) تصادم کہا جاتا ہے۔ اس میں اگرچہ ہزاروں معصوم اور بے گناہ آدمی مرتے ہیں لیکن ان پر ایک ہی دفعہ بم برسا کر انھیں موت کے گھاٹ اتارنے کے مقابلے میں، اس طرح اموات سُست رفتاری سے ہوتی ہیں۔ اس صورت میں آپ اس ملک کے قلب کو مبتلائے مرض (infect) کرتے ہیں، آپ ایک سرطانی پھوڑا پیدا کرتے ہیں اور کینسرین کو بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں۔ جب آبادی ٹھکست خوردہ ہو جائے — یا ماریڈی جائے ایک ہی بات ہے — اور آپ کے اپنے دوست، فوج اور بڑی کارپوریشنیں، آرام سے اقتدار پر بیٹھ جائیں تو آپ کیمرے کے سامنے جا کر کہتے ہیں کہ ”جمہوریت قائم ہوگئی ہے“۔ یہ امریکی خارجہ پالیسی میں ان برسوں میں عام بات تھی جن کا میں ذکر کر رہا ہوں..... دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد امریکا نے دنیا میں دائیں بازو کی ہر فوجی آمریت کی حمایت کی اور اکثر صورتوں میں اسے قائم کیا۔ میرا مطلب انڈونیشیا، یونان، یوراگوئے، برازیل، پیراگوئے، ہیٹی، ترکی، فلپائن، گوائے، مالا، سلواڈوار اور یقیناً چلی سے ہے۔ ۱۹۷۳ء میں امریکا نے صرف چلی میں جو خونخاک زخم لگائے ان کا ازالہ ممکن نہیں اور اسے ہرگز معاف نہیں کیا جاسکتا۔ ان تمام ممالک میں لاکھوں آدمی مارے گئے۔ کیا ان سب اموات کو امریکی خارجہ پالیسی کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ جواب ہے: ہاں۔ ان سب اموات کا سبب امریکی خارجہ پالیسی ہی تھی.....

امریکا کے جرائم منظم، فاسقانہ بے رحمانہ اور کسی قسم کی پشیمانی کے بغیر عمل میں آتے رہے ہیں مگر بہت کم لوگوں نے ان کے بارے میں کھل کر بات کی ہے۔ اس نے نیکی کے لیے ایک طاقت، کا بہروپ بھر کر، اسے نہایت کمال فن سے پوری دنیا میں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ آپ کو امریکا کو داد دینی پڑتی ہے۔ یہ پٹانزم کا ایک شان دار ذہانت سے بھرپور اور غیر معمولی کھیل ہے۔

میں آپ سے کہتا ہوں کہ امریکا سب کی آنکھوں کے سامنے یہ کھیل کھیل رہا ہے۔ امریکا کا یہ ڈراما بے حد ظالمانہ، وحشیانہ اور نفرت انگیز ہے۔ اس سے امریکا کی مکاری بھی ظاہر ہوتی ہے.....

ہماری اخلاقی جس کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا کبھی ہماری یہ حس تھی بھی؟ کیا ان الفاظ کے کوئی معنی ہیں؟ کیا یہ ایک ایسے لفظ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو آج کل بہت کم استعمال کیا جاتا ہے، یعنی ضمیر؟ صرف ہمارے اپنے افعال کے ساتھ نہیں، بلکہ دوسرے کے افعال میں جو ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے اس میں بھی۔ کیا ہمارا ضمیر مردہ ہو چکا ہے؟

گوانتانامو بے کوڈیکھے، سیکڑوں افراد کی الزام کے بغیر تین سال سے زائد عرصے سے قید ہیں۔ انھیں قانونی چارہ جوئی کا کوئی حق نہیں۔ ان پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا جا رہا۔ عملی طور پر وہ عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ جینو اکنونشن کے علی الرغم کلی طور پر ناجائز یہ کارروائی جاری ہے۔ نہ صرف یہ کہ اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا جا رہا ہے بلکہ جسے ہم عالمی برادری کہتے ہیں، اسے بھی اس کی کوئی فکر نہیں۔ یہ مجرمانہ کارروائی ایک ایسا ملک کر رہا ہے جو اپنے آپ کو آزاد دنیا کا قائد قرار دیتا ہے.....

عراق پر حملہ ایک قزاقانہ اقدام تھا۔ یہ بین الاقوامی قانون کی حد درجے کی توہین تھی اور کھلی کھلی ریاستی دہشت گردی۔ یہ حملہ ایک فوجی حملہ تھا، اس کے لیے جھوٹ پر جھوٹ گھڑا گیا۔ اس حملے کا مقصد مشرق وسطیٰ میں امریکا کے فوجی اور معاشی کنٹرول کو مستحکم کرنا تھا۔ ہر طرح کی وجوہ ثابت کرنے میں ناکامی کے بعد آخری چارہ کار کے طور پر آزادی دلانے کا بہانہ بنایا گیا۔ فوجی طاقت کے اس مظاہرے سے ہزاروں لاکھوں

معصوم لوگوں کی موت اور تباہی واقع ہوئی ہے۔

ہم نے عراقی عوام کو کیا دیا ہے؟ مارچ، کلسٹر بم، ڈپلینڈ یورینیم، بلا لحاظ قتل و غارت کے لاعداد واقعات اور ان کی توہین اور تذلیل، مگر اس کے باوجود کہتے ہیں کہ ہم مشرق وسطیٰ کے لیے آزادی اور جمہوریت لائے ہیں۔

ایک شخص کو جنگی مجرم اور قتل عام کا مرتکب قرار دینے کے لیے آخر آپ کو کتنے آدمی مارنا ہوتے ہیں۔ ایک لاکھ؟ میرے خیال میں یہ کافی ہیں۔ اس لیے یہ انصاف کا تقاضا ہے کہ بش اور بلیر کو عالمی عدالت کے سامنے لایا جائے۔ لیکن بش چالاک ہے۔ اس نے انٹرنیشنل کریمنل کورٹ آف جسٹس کی توثیق نہیں کی ہے۔ اب اگر کوئی امریکی فوجی یا سیاست دان ہی سہی کٹہرے میں لایا جائے گا تو بش نے دھمکی دے رکھی ہے کہ وہ اپنی فوجیں بھیج دے گا۔ لیکن ٹونی بلیر نے اس عالمی عدالت کی توثیق کی ہے اس لیے بلیر پر تو مقدمہ چلایا جاسکتا ہے۔ اگر عدالت کو دل چسپی ہے تو ہم اس کا پتا بتائے دیتے ہیں: مسٹی ٹونی بلیر ساکن ۱۰-ڈاؤنگ اسٹریٹ لندن۔

عراق میں مزاحمت کے شروع ہونے سے پہلے ہی امریکی بموں اور میزائلوں سے کم سے کم ایک لاکھ عراقی ہلاک ہو چکے تھے۔ کیا ان لوگوں کی کوئی حیثیت نہیں؟ ان کی اموات کوئی معنی نہیں رکھتیں؟ ان اموات کا کوئی ریکارڈ بھی نہیں اور ضرورت بھی کیا ہے۔ اس لیے امریکی جنرل ٹونی فرانکس نے کہا ہے کہ ہم لاشیں نہیں گنتے۔

(دی گارڈین ۸ دسمبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۰-۱۲)

ہرالڈ ہنٹر نے بستر علالت سے مظلوم انسانیت اور امریکا کے ہاتھوں زخم خوردہ اور ستم زدہ افراد و اقوام کی طرف سے کلمہ حق کہہ کر فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ بر انسانیت کے ضمیر کی آواز ہے جسے کوئی آج سنے یا نہ سنے، کل ان شاء اللہ اسی آواز سے پوری دنیا۔ بے دروہام گونجیں گے۔

امریکا کے جمہوری نظام کے لیے آج صدر بش ان کی انتظامیہ اور نیوکون کا پورا طائفہ ایک خطرہ بن گئے ہیں۔ صدر بش نے دستور کے الفاظ اور روح دونوں کی خلاف ورزی کی ہے اور

اپنی راج ہٹ پر قائم ہیں۔ انھوں نے تقرریوں کے نام پر دستور کے متعین طریقے کو ترک کر کے اعلیٰ مناصب پر چور دروازوں سے اپنے پسندیدہ افراد کو مسلط کیا ہے اور اس ضمن میں کانگریس اور سینیٹ کو بھی نظر انداز کرنے میں کوئی تردد محسوس نہیں کیا۔ عام شہریوں کی جاسوسی اور ان کی نجی زندگی کی تقدیس کو پامال کیا اور اس پر عوامی احتساب کو حقارت کے ساتھ نظر انداز کر دیا ہے۔ فوج اور سی آئی اے کے ذریعے انسانیت سوز مظالم کو روا رکھا ہے بلکہ عملاً اسے سند جواز فراہم کی ہے اور اب جب دفاعی بل میں سینیٹر میک کین کی ترمیم کے ذریعے نارجر پر کھلی پابندی لگائی گئی ہے تب بھی نئے قانون پر دستخط کرنے کے بعد ایک سرکاری اعلامیے میں صدر کے امتیازی اور صوابدیدی اختیار کا اعادہ کیا گیا ہے، جب کہ سینیٹ نے نائب صدر ڈک چینی کی ساری کوشش کے باوجود صدر کو استنفا کرنے کا اختیار دینے سے انکار کر دیا تھا جس سے قانون سازوں کی نیت کسی ابہام کے بغیر واضح ہو گئی تھی۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس وقت امریکا کے 'جمہوری ڈھانچے' پر جو گروہ مسلط ہے وہ شہنشاہی (imperial) فکر کا حامل ہے۔ نیوزویک بالعموم صدر بش کی حمایت کی روایت پر قائم ہے، لیکن اس کا مدیر بھی اس ذہنیت پر گرفت کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ امریکا کی قیادت جمہوریت کے پہلے اصول، یعنی قانون کی پاسداری کی خلاف ورزی تو کر رہی ہے لیکن جمہوریت کی روح، یعنی دوسرے کی بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ فرید زکریا An Imperial Presidency کے عنوان سے نیوزویک کے ۱۹ دسمبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں لکھتا ہے کہ صدر بش کے دور میں:

امریکا نے جمہوریت کا ایک شہنشاہی انداز اختیار کیا ہے۔ بیرونی ممالک کے لیڈروں سے کافی ربا و ضبط ہے مگر یک طرفہ ہے۔ جن بیرونی لیڈروں سے مشورہ کیا جاتا ہے، وہ اسل انیس امریکی پالیسی کی فقط اطلاع دی جاتی ہے۔ ”جب ہم امریکی افسروں سے ملتے ہیں، وہ بولتے ہیں، ہم سنتے ہیں۔ ہم شاذ ہی اختلاف کرتے ہیں یا کھل کر بولتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتے۔“ یہ بات ایک سینیٹر افسر خارجہ نے اپنے مقابل امریکی افسروں کو ناراض کرنے کے خوف سے اپنا نام ظاہر نہ کرنے کی شرط پر بتائی۔ شہنشاہی انداز جو ناراضی پیدا کرتا ہے، اس سے قطع نظر بے نیازانہ رویے

کا مطلب یہ بھی ہے کہ امریکی افسران غیر ملکیوں کے تجربے اور مہارت سے مستفید نہیں ہو پاتے..... غیر ملکیوں کو امریکی افسر اُس دنیا کے بارے میں جو وہ چلا رہے ہیں بڑی حد تک بے خبر نظر آتے ہیں..... شہنشاہی انداز کی اپنی خوبیاں بھی ہیں۔ یہ خوف زدہ کرتا ہے، فیصلہ کن اقدام کے لیے جواز فراہم کرتا ہے اور دوسرے ممالک کو اپنے پیچھے آنے پر مجبور کرتا ہے لیکن یہ قیمتوں کو بہت زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اس لیے جس دنیا میں ہم داخل ہو رہے ہیں، اس کے لیے تو خاص طور پر نامناسب ہے۔ (نیوز ویک، ۱۹ دسمبر ۲۰۰۵ء)

اور یہی وہ انداز 'جمہوریت' ہے جو بش کی قیادت میں امریکا نے رائج کیا ہے لیکن اس کا نتیجہ ہے کہ خود امریکا میں آج جمہوریت کو اصل خطرہ ان نام نہاد دہشت گردوں سے نہیں جن کے سایوں (shadows) کا تعاقب کیا جا رہا ہے بلکہ ان جلادوں سے ہے جو جمہوریت کے نام پر جمہوریت کے ہر اصول، روایت اور قدر کا خون کر رہے ہیں۔

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ امریکی دستور میں بڑی اچھی باتیں لکھی گئی ہیں۔ ہمیں اس سے بھی انکار نہیں کہ امریکی نظام حکومت میں بہت سی اچھی چیزیں بھی ہیں اور عام امریکیوں میں بہت سی وہ انسانی خوبیاں موجود ہیں جو شرفِ انسانیت کا حصہ ہیں۔ امریکا میں آج بھی بڑی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو موجودہ امریکی قیادت کی پالیسیوں اور اقدامات پر ناخوش ہیں یا ماضی کی ان پالیسیوں پر جو امریکا کی مختلف قیادتیں اپنے اپنے دور اقتدار میں کرتی رہی ہیں۔ ان مثبت پہلوؤں کے کھلے دل سے اعتراف کے ساتھ ہم یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ امریکی حکمران خصوصیت سے نائن لیون کے بعد جس راستے پر چل پڑے ہیں، وہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی نفی ہے اور عالمی امن و سلامتی کے لیے یہ راستہ بڑا خطرناک ہے۔ امریکا کی ان پالیسیوں نے دہشت گردی میں اضافہ کیا ہے اور دنیا کی مختلف اقوام، خصوصیت سے مسلمان اقوام کے چین اور سکون و اطمینان کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور امریکا اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف عملاً صف آرا کر دیا ہے، نیز دنیا کی تمام کمزور قوموں اور ان کے عوام کو ظلم اور محرومی کی آگ میں دھکیل دیا ہے۔ طاقت کی عدم مساوات نے عالمی سطح پر ایک ایسے نئے قسم کے عدم تحفظ کو جنم دیا ہے جو کمزور

انسانوں کو ایسا راستہ اختیار کرنے کی طرف دھکیل رہا ہے جس سے دنیا میں تشدد خون ریزی اور دہشت گردی میں اضافہ ہو رہا ہے۔

یہ حالات سب کے لیے بڑے خطرناک ہیں اور امریکا کو اس زعم میں نہیں رہنا چاہیے کہ وہ محض قوت اور پروپیگنڈے کے بل بوتے پر اقوامِ عالم پر قبضہ کر سکتا ہے اور ان کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے۔ یہ فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ ہوش مندی کا راستہ یہ ہے کہ امریکا سے بے زاری اور نفرت کے اسباب کا بے لاگ جائزہ لیا جائے اور وہ اسباب جو دوری اور نفرت پیدا کر رہے ہیں ان کو دور کیا جائے۔ ظلم اور ناانصافی کا خاتمہ کیا جائے اور بقائے باہمی کے اصول پر انصاف اور ایک دوسرے کی آزادی، حقوق اور تہذیب و روایات کے احترام کی بنیاد پر عالمی امن کے حصول کی کوشش کی جائے۔ اس کے سوا جو بھی راستہ ہے وہ تباہی کا راستہ ہے اور یہ تباہی وہ ہے جس کی آگ صرف کمزوروں کو اپنی گرفت میں نہیں لیتی بلکہ طاقت ور بھی اسی طرح اس کا نشانہ بنتے ہیں جس طرح کمزور۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ طاقت کی بنیاد پر انسانی مسائل و معاملات کو حل کرنے کی حماقت نہ کی جائے بلکہ عقل و انصاف اور افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کیا جائے کیوں کہ یہی وہ راستہ ہے جس میں سب کی فتح ہے اور شکست کسی کی بھی نہیں۔

اگر آپ کو ترجمان القرآن بطور تحفہ ملا ہے اور آپ اسے پہلی دفعہ دیکھ رہے ہیں تو ازراہ کرم پوری توجہ سے کچھ وقت نکال کر پورے رسالے کا مطالعہ کریں اور پھر فیصلہ کریں کہ ایسا رسالہ آپ کے گھر میں ہر ماہ پابندی سے آنا مفید ہوگا یا نہیں۔ آپ کا گھر انا تعلیم یافتہ ہے بزرگ و جوان، مرد و عورت سب اس ملک کے باشندے شہری ہیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ ذاتی تربیت و اصلاح اور ملک و ملت کے مسائل پر آگہی ہر دو لحاظ سے یہ آپ کا معاون ہے۔ اگر آپ طالبہ/طالب علم ہیں تو اس کا مطالعہ آپ کے عمومی تعلیمی اور علمی معیار میں اضافہ کرے گا۔

آپ اسے اچھا پاتے ہیں تو دوسروں سے بھی اس کی افادیت کا تذکرہ کریں۔